ڈاکٹر پروین کلو

ترجمہ معیارات اور افادیت

Word Translation was derived from Latin Language. Its literal meaning to cross .Translation brings to close different nations, cultures and languages. There are many factors to flourish human knowledge. Translation also performed a stronger role to flourish it. In every era, Translation conveys different thoughts and ideas to different nations. Though one translation expresses other language, it also gives its expansion and enrichments. The need of Translation belongs the flourishment of knowledge and language. Language is expanded through translation because on one hand it expresses poetry and on the other hand it also becomes the language of philosophy. When a nation takes steps to progress in knowledge and fine arts, first of all it makes its language prosperous with the Translation of different languages. If there was no culture of translation, the word would become deaf and dumb. If a translator has a high quality of creation, and he is honest then his Translation would be better than the original. Translation should be the nectar of the writer .The temperament should be remained same as the original language. A good translation comes to existence, when translator goes into the mind of the writer and there should be real soul of the writer .This is the exact quality of translation. The translator should be well aware of the topic of the translation and he should be expert of both languages. Progress of human culture is not bound to one nation, but its progress is a collective efforts and Translation has a major role for its progress, so we can not deny the benefits of good translation.

ٹرانسلیشن کا لفظ مغرب کی جدید زبانوں میں لاطینی سے آیا ہے اور اس کے لغوی معانی ہیں پار لے جانا۔ اس سے قطع نظر کہ کوئی خاص مترجم کسی کو پار اتارتا بھی ہے کہ نہیں یہ مفہوم نقل مکانی سے لے کر نقل معانی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس طرح اردو اور فارسی میں ترجمے کا لفظ جس کا اشتقاقی رابطہ ترجمان اور مترجم دونوں سے ہے عربی زبان سے آیا ہے۔ اہل لغت اس کے کم سے کم چار معنی درج کرتے ہیں۔ ایک سے دوسری زبان میں نقل کلام، تفسیر و تعبیر، دیباچہ اور کسی شخص کا بیان احوال یا تذکرہ شخصی ہے۔ امریکہ میں ترجمے کے لیے دوبارہ تخلیق (Recreation) کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ترجمہ ہر دور میں ہر زبان کی

اہم ترین ضرورت رہا ہے۔ یہ مختلف قوموں، زبانوں اور ثقافتوں کے درمیان پڑے ہوئے اجنبیت کے پردے چاک کر کے انہیں ایک دوسرے سے قریب لاتا ہے اور ہر زبان کی ترقی، پھیلاؤ اور وسعت میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں کہ!

> ''انسانوں کے درمیان باہمی ارتباط، اتحاد اور یگانگت کی راہ میں جو سب سے اہم فطری رکاوٹ حائل رہی ہے شاید وہ زبانوں کا فرق ہے۔ اس فرق کو مٹانے اور انسان کے علم و عرفان اور ادب کو بنی نوع انسان کی مشترک میراث بنانے میں ترجمہ نے جو اہم اور نتیجہ خیز کردار ادا کیا ہے انسانی تہذیب کی تاریخ کا ہر ورق اس کا گواہ ہے۔ ترجمہ نے ہی ایک قوم کے ذخیرہ علم و ادب کو دوسری قوموں تک پہنچایا ہے اور ایک انسانی گروہ کے تجربات سے دوسری جماعتوں کو فیض اٹھانے کا موقع دیا ہے۔ اس ذخیرہ میں جیسے جیسے توسیع و اضافہ ہوتا رہا ہے ترجمہ کی رفتار بھی تیز تر ہوتی رہی ہے۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ انسانی علوم کو فروغ دینے میں جہاں اور بہت سے اسباب اور عوامل رہے ہیں وہاں ترجمہ بھی ایک طاقتور محرک کا کردار ادا کرتا رہا ہے۔''(۱)

ترجمہ نے ہر عہد میں نئے نئے افکار و نظریات کو ایک قوم سے دوسری قوم تک پہنچایا ہے، ایک تہذیب کو دوسری تہذیب سے روشناس کروایا ہے۔ ترجمہ کے ذریعہ ہی ایک زبان دوسری زبان کے اظہارات، اس کے مزاج اور اس کی نحوی ساخت سے متعارف ہو کر اپنا روپ رنگ بدلتیا ور وسعت حاصل کرتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج جب دنیا کی طنابیں کھنچ رہی ہیں اور علم عالمگیر سطح پر ایک اکائی بنتا جا رہا ہے، کوئی زبان بھی ترجمے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ جب تک نئے خیال کا خون اور نئی آگہی کا نور رگ و پے میں سرایت نہ کرے زندگی دشوار ہے۔ یہی نہیں بلکہ آج کی دنیا میں زبانوں کی مقبولیت پھیلاؤ اور اہمیت کا دارومدار بڑی حد تک ان کے مفید ہونے پر ہے اور افادیت کا پیمانہ یہ ہے کہ کوئی زبان اپنے زمانے کے علمی سرمائے اور ادبی ذخیرے کو کس حد تک اپنے پڑھنے والوں تک پہنچانے کی اہل ہے۔

> ''ترجمہ بڑا مشکل کام ہے۔ یہ نگینہ جڑنے کا فن ہے جو بڑی مہارت اور ریاضت چاہتا ہے۔ ایک زبان کے معانی اور مطالب کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنے کے لئے کہ اصل عبارت کی خوبی اور مطلب جوں کا توں باقی رہے، دونوں زبانوں پر یکساں قدرت کی ضرورت ہوتی ہے، جو عام طور پر کمیاب ہوتی ہے۔''(۲)

ترجمے کے بارے میں ڈاکٹر نثار قریشی لکھتے ہیں۔

> ''ترجمے کی ضرورت علم اور زبان کی افزائش سے تعلق رکھتی ہے اور ہم نہ صرف زبان کی وسعت چاہتے ہیں بلکہ ذہن کی وسعت بھی ہمارے سامنے ہوتی ہے۔ ترجمہ دراصل دو زبانوں اور دو تہذیبوں کے مابین پل کا کام دیتا ہے، جس کے ذریعے خیالات اور تصورات ایک تہذیب سے دوسری کی طرف اور ایک ملک سے دوسرے ملک کی جانب جاتے ہیں اور اس سارے عمل میں درآمد اور برآمد دونوں کیفیتیں شامل ہوتی ہیں۔ ایک طرف کے تصورات دوسری طرف اور دوسری طرف کے اس جانب آتے ہیں۔ ترجمے کی ضرورت تہذیبی نشوونما کے لیے بھی لازمی ہے کیونکہ تہذیبیں ایک عرصے کے بعد اپنے سرچشموں کو خشک کر دیتی ہیں اور اپنے آپ میں سے پھر کوئی نئی شے پیدا نہیں کر سکتیں، اس طرح وہ ذہنی علیحدگی اور یک طرفہ تہذیبی تعصب کا شکار ہو جاتی ہیں۔''(۳)

ترجمے کے ذریعے زبان کئی طرح پھلتی اور پھولتی ہے اور اس کی کئی طرح کی خوبیاں ترجمے کے مضامین کے حوالے سے

پیدا ہوتی ہیں۔ وہ ایک وقت میں علم الشعر کو بیان کر سکتی ہے اور دوسرے وقت میں وہی زبان فلسفے کی زبان بھی بن سکتی ہے۔ دوسری زبانوں سے صرف الفاظ کا ترجمہ ہی نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی روح کو بھی دوسری زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔

انسان جس قدر آسانی سے اپنی زبان میں افہام و تفہیم کر سکتا ہے دوسری زبان میں اتنا آسان نہیں ہوتا۔ ضروری ہے کہ ان علوم کو اپنی زبان میں ڈھال دیا جائے تا کہ عام سطح کی ذہانت رکھنے والا شخص بھی سمجھ سکے اور قومی ترقی میں حصہ لے سکے۔ یوں ادبیات عالم کا ارتقاء بڑی حد تک تراجم ہی کا مرہون منت ہے۔ مشرق اور مغرب ہر دو اطراف میں ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمے کی روایت بہت قدیم ہے۔ اردو میں ترجمے کے اولین دور کے نظریہ ساز ناقد حاجی احمد فخری کے الفاظ میں،

> ''یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ جب کوئی قوم علوم و فنون میں ترقی کا پہلا قدم اٹھاتی ہے تو سب سے پہلے علمی زبانوں کے تراجم سے اپنی زبان کو سرمایہ دار بناتی ہے اور اپنے علمی خزانوں کو معمور کرتی ہے۔''(۴)

کئی ایک دوسری سرگرمیوں کی طرح ترجمے کا عمل بھی انسان کو انسان کے قریب لاتا ہے اور ذہن کی سرحدیں پھیلاتے ہوئے کہتا ہے زبانیں مختلف سہی، ملک دور دور سہی، مگر انسان ایک غیر منقسم صداقت ہے۔

> ''تراجم کا عمل انسانی تمدن، مزاج اور تاریخ کی دریافت اور شناخت کا ایک بھرپور ذریعہ ہے۔ انسان جو رنگوں، زبانوں اور جغرافیائی بندشوں، سیاسی تفرقات کی بدولت انسان ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہے، ترجمے کے ذریعے ایک زبان کو اپنی زبان کے حروف تہجی میں ڈھالنے سے انسانی سطح پر ایک دوسرے سے تعارف حاصل کرتا ہے۔ ابھی تک ہمارا غیر ملکی دنیا سے تعلق صحافتی و اخباری سطح پر رہا ہے۔ اپنے آپ کو جذباتی اور ذہنی سطح پر باخبر رکھنے کے لئے دوسروں کا دکھ درد جاننے اور شرکت کرنے کے لئے ترجمہ ہی ایک ایسا وسیلہ ہے جو خبر کا ذریعہ بنتا ہے۔ جو انسانوں میں اشتراک کا قرینہ پیدا کرتا ہے۔''(۵)

چنانچہ زبان کی توسیع تمدن کے تعارف، انسانی کائنات کی دریافت اور تاریخ کے وقوف کے لئے ایک سے زیادہ زبانوں سے رابطہ پیدا کرنا ضروری ہے۔ مترجم ایک ایسا کردار ہے جو خارج کے مصنف کے ساتھ ساتھ داخل کے مصنف کو بھی ڈھونڈ نکالتا ہے۔ ترجمے کا عمل اس حد تک پیچیدہ اور پراسرار عمل ہے کہ ایک شخصیت دوسری شخصیت میں ڈھلتی ہے۔ مرزا حامد بیگ ترجمے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ایک برتن سے دوسرے برتن میں انڈیلنا یا ایک پرانی شراب کو نئی بوتل فراہم کرنا ہے''۔(۶)

ترجمے ہی کی بدولت قومیں اور تہذیبیں، مسافت اور جغرافیے کی دقتوں کے باوجود ایک دوسرے سے آشنا ہوتی ہیں اور انسانوں کے مختلف گروہ دوسرے گروہوں کو پہچاننے لگتے ہیں اور انسانی برادری کا چہرہ نظر آنے لگتا ہے، جس کی جانب انسان ہمیشہ سے سفر کر رہا ہے۔

> ''ترجمے کا تعلق اصل تصنیف سے تقریباً وہی ہے جو شہاب ثاقب کا نجوم و کواکب سے ہوتا ہے۔ یہ بھی اکثر اوقات ایک نہ ایک سیارے سے جدا ہو کر تاریخ کے کسی نہ کسی ریگستان میں گم ہو جاتا ہے یا پھر اپنی اصل کے دائرہ کشش ثقل میں گردش کرتے کرتے خود بھی ایک چھوٹا موٹا سیارہ بن جاتا ہے۔''(۷)

ترجمے کے ذریعے زبان کئی اعتبار سے پھلتی پھولتی ہے ترجمہ جہاں الفاظ اور زبان کی نشوونما کے ذریعے انسانی علوم میں اضافے کا باعث بنتا ہے وہیں ذہنی سرحدوں کو بھی کشادگی بخشتا ہے۔ زبان کی سطح پر ترجمہ خیالات و جذبات کی ہر ہر کروٹ کو سمونے کی خاطر نت نئے اسالیب بیان سے متعارف کرواتا ہے۔ ڈاکٹر ظہیر احمد یوں رقم طراز ہیں کہ:

> ''ترجمے کا عمل دو زبانوں اور دو تہذیبوں کے مابین پل بنانے کا کام کرتا ہے جبکہ متن کا اس کی تمام

اسلوبیاتی،موضوعی اور تکنیکی خصوصیات کے ساتھ کسی دوسری زبان میں منتقل ہوجانا ترجمے کا اصل گن ہے''۔(۸)

سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ جوں جوں دنیا کے ملک ایک دوسرے سے قریب آنے کی کوشش کررہے ہیں،اس قدر ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھنے اور مزاج سے آگہی حاصل کرنے کی ضرورت بھی محسوس ہورہی ہے۔لیکن یہ سب کچھ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک زبان کو واسطہ نہ بنایا جائے۔مگر دشواری یہ ہوتی ہے کہ

''زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم۔''(۹)

یہاں پر زبان کی ناواقفیت ترجمہ کے سہارے دور کی جاتی ہے۔

''اگر ترجمہ کا دستور نہ ہوتا تو دنیا گونگوں کی بستی ہوکر رہ جاتی۔ترجمہ کی ضرورت انفرادی بھی ہوتی ہے اور اجتماعی بھی،ایک ملک یا ایک کلچر کے خیالات کو دوسرے ملک یا کلچر کی زبان میں منتقل کرنے کو ترجمہ کہتے ہیں۔فارسی اور انگریزی بولنے والی قوم نے جب فکر و جذبات کے دیسی طریقوں سے اپنے آپ کو قریب کرنا چاہا تو ترجموں سے مدد لی۔''(۱۰)

کسی بھی زبان کے ادب میں جس طرح تخلیقی ادب کا پیدا ہونا اور جاری رہنا بہت اہم عمل ہوتا ہے اسی طرح زندہ زبانوں کے اندر ادیبوں نے دوسری زبانوں کے شہ پاروں کے ترجمے کی اہمیت پر بھی اتنا ہی زور دیا ہے۔اگر مترجم اعلیٰ درجہ کی تخلیقی صلاحیت کا مالک ہو اور ترجمہ دیانت داری سے کرلے تو اس کا ترجمہ اصل تخلیق سے زیادہ دقیع فن پارہ بن سکتا ہے۔اس لیے کہ ترجمہ کے عمل میں دو تخلیقی جوہر بروئے کار ہوتے ہیں۔ایک مصنف کا اور دوسرا مترجم کا۔مترجم کا کام یہ ہے کہ وہ اصل تخلیق سے پیدا ہونے والے تاثرات میں اس طرح ڈوب جائے کہ وہ اس کا اپنا تجربہ معلوم ہوں،پھر وہ تخیل کی مدد سے ان تاثرات کو اپنی ہی زبان کے ایسے پیکر میں ڈھالے کہ اس زبان کے قارئین بھی اس کے تاثرات سے اسی طرح محظوظ ہوں جس طرح وہ خود ہوا تھا۔جہاں تک اردو زبان میں ترجمے کی روایت کا تعلق ہے تو سہولت کی خاطر ہم پورے سرمائے کو تین حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

۱۔ صنفی

۲۔ تخلیقی و غیر تخلیقی

۳۔ نثری و شعری

ان کے ساتھ ساتھ ترجمے کی مندرجہ ذیل اقسام بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

(الف) (i)علمی ترجمہ (ii)ادبی ترجمہ (iii)صحافتی ترجمہ

(ب) اسی طرح ترجمے کی تین راہیں بھی ہیں۔

(i)لفظی ترجمہ (ii)آزاد ترجمہ (iii)معتدل ترجمہ

ترجمے کے کام کو اب تک تصنیف کے مقابلے میں عام طور پر حقیر سمجھا گیا ہے یہ بہت غلط میلان ہے۔ترجمے کی اہمیت کسی طرح تخلیق سے کم نہیں،ترجمے میں تخلیق کو از سرِ نو پانا ہوتا ہے۔ترجمے کے ذریعے سے ہم دوسری زبانوں کے افکار و اقدار سے آشنا ہوتے ہیں۔

''ترجمہ اس طرح کیا جائے کہ اس میں مصنف کے لہجے کی کھنک اور آہنگ بھی باقی رہے،اپنی زبان کا مزاج بھی بنیادی طور پر موجود رہے اور ترجمہ اصل متن کے مطابق بھی ہو۔ترجمہ کی یہ شکل سب سے زیادہ مشکل ہے ایسا ترجمہ جس میں مترجم نے مصنف کی اصل روح کو پاکر اپنی زبان کے مزاج میں نگینے کی طرح بٹھا

دیا ہو، ایک ایسا ہی گوہر نایاب ہے جیسے ادب کا کوئی شہ پارہ جو کبھی کبھار وجود میں آ کر کسی تہذیب کی ساری روح کا مظہر بن جاتا ہے۔ ایسے ترجموں سے زبان و بیان کو ایک فائدہ تو یہ پہنچتا ہے کہ زبان کے ہاتھ بیان کا ایک نیا ڈھنگ اور اسلوب کا ایک نیا امکان آ جاتا ہے۔''(۱۱)

ترجمہ کرنے والا اپنی شخصیت اور مزاج کو کھو کر دوسرے کی شخصیت اور مزاج میں انہیں تلاش کرتا ہے۔ کھو کر پانا اور پا کر کھونا اچھے ترجمے کے بنیادی عناصر ہیں۔ اچھا ترجمہ اسی وقت وجود میں آ سکتا ہے جب مترجم نے نیک نیتی کے ساتھ اپنی شخصیت کو کھو کر مصنف کی شخصیت میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہو۔ اپنی ذات کی نفی اور اپنی شخصیت سے انکار ایک اچھے مترجم کے لیے ضروری ہے۔

''تحریری ترجموں کے تین طریقے ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ لفظوں کے آہنگ مصنف کے لہجے، بیان کے تیور اور ابلاغ کو کوئی خاص اہمیت نہ دی جائے اور اصل متن کا صرف لفظی ترجمہ کر دیا جائے اور بس۔ اسے ترجمہ کرنا نہیں کہتے، مکھی پہ مکھی مارنا کہتے ہیں۔''(۱۲)

ترجمے میں اصل مصنف کی روح بول اٹھے یہی اچھے ترجمے کی خوبی ہے اور مترجم اس موضوع سے واقفیت رکھتا ہو اور اپنی زبان کے سرمائے پر بھرپور نظر کے علاوہ اصل زبان سے بھی اچھی طرح واقف ہو۔ اگر وہ موضوع سے واقف ہے اور اصل زبان سے بڑی حد تک آشنا ہے مگر اپنی زبان کے سرمائے پر اس کی نظر نہیں ہے تو وہ جا بجا ٹھوکریں کھائے گا۔ اس کی زبان اکھڑی اکھڑی ہوگی اور اس کا ترجمہ پڑھنا ایسا ہوگا جیسا ناہموار راستے سے گزرنا۔

انسانی تہذیب کی ترقی کسی ایک گروہ سے وابستہ نہیں اس کی ترقی مجموعی انسانی ترقی ہے اور اس ترقی میں ترجمے کا بڑا ہاتھ ہے۔ یوں ترجمہ محض علوم کے فروغ ہی میں حصہ نہیں لیتا ہے بلکہ انسانی گروہوں کے درمیان ذہنی مفاہمت بھی پیدا کرتا ہے۔ زبانوں کا فرق ہمیشہ سے مختلف قوموں اور گروہوں کے درمیان اتحاد و یگانگت میں ایک بڑی رکاوٹ رہا ہے۔ جبکہ ترجمے کی تہذیب اس رکاوٹ کو دور کرتی ہے۔ ماضی پر نگاہ ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ ادبیات عالم میں تاریخی ادوار اور انسانی تمدن کی شناخت و بازیافت کا واحد ذریعہ ترجمہ ہی رہا ہے۔ دراصل ترجمے کا منشا ہی اصل کے خیال اور مفہوم کی ادائیگی ہے اور اس منشا کو پورا کرنے کیلئے زبان کا پورا پورا علم اور مکمل اندازہ ضروری ہے۔

''جس زبان سے ترجمہ کیا جا رہا ہے اس زبان کی لغت سے اصطلاحات اور محاوروں سے اور کسی قدر ادبیات سے تھوڑی بہت واقفیت شرط اوّل ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جس زبان کی تصنیف کا ترجمہ کرنا ہے اس زبان پر ترجمہ کرنے والے کو ماہرانہ عبور حاصل ہو اور وہ اصل عبارت یا اصل تصنیف والی زبان میں خود بھی اسی طرح بے تکلف اور بے تکان لکھ سکتا ہو یا بول سکتا ہو بلکہ اس زبان کا صرف کتابی علم کافی ہے۔ ورنہ خیال کی نزاکتیں ہاتھ سے نکل جائیں گی، اصل عبارت کی نوک پلک پر ترجمہ کرنے والے کا دھیان نہیں جائے گا اور وہ اسے ترجمے میں منتقل کرنے کی طرف سے غافل رہے گا۔''(۱۳)

کسی مصنف کے خیالات کو لیا جائے، ان کو اپنی زبان کا لباس پہنایا جائے، ان کو اپنے الفاظ و محاورات کے سانچے میں ڈھالا جائے اور اپنی قوم کے سامنے اس انداز سے پیش کیا جائے کہ ترجمے اور تالیف میں کچھ فرق معلوم نہ ہو۔ الفاظ اور عبارت کا ترجمہ کرنے کیلئے علیحدہ علیحدہ اصول ہیں۔ الفاظ کا ترجمہ کرنے کے لئے مندرجہ ذیل اصول کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ ترجمہ صحیح ہونا چاہئے۔
۲۔ حتی الامکان عام فہم ہونا چاہئے۔
۳۔ سبک اور خوبصورت ہونا چاہئے۔

الفاظ کا ترجمہ کرنا پھر بھی نسبتاً آسان ہے لیکن عبارت کا ترجمہ کرنا اکثر مشکل ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں دو متضاد تقاضوں سے واسطہ پڑتا ہے ایک طرف تو یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ترجمہ حتی الامکان تحت اللفظ ہو۔ اصل عبارت کا محض لب لباب یا تبصرہ نہ ہو اور دوسری طرف ترجمے کی زبان کا محاورہ ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ ہر زبان میں مخصوص اسالیب ہوتے ہیں جن کا لفظی ترجمہ دوسری زبان میں نہیں ہوسکتا۔ ایسی صورت میں یا تو ترجمے کی زبان کا کوئی ایسا اسلوب اظہار یا محاورہ تلاش کرنا پڑتا ہے جو اصل کا لفظی ترجمہ نہ ہو بلکہ اس کے مرکزی خیال کو ادا کرتا ہو یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر ترجمے میں جملے کی ساخت حسب ضرورت تبدیل کرنی پڑتی ہے یا الفاظ گھٹانے بڑھانے پڑتے ہیں تاکہ مطلب حتی الامکان صفائی اور محاورے کے ساتھ ادا ہو جائے۔ عبارت کا ترجمہ کرنے کے لیے حسب ذیل اصول اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

۱۔ ''ترجمہ حتی الامکان تحت اللفظ ہونا چاہئے اصل عبارت کا محض خلاصہ مطلب نہیں ہونا چاہئے۔

۲۔ ترجمہ حتی الامکان محاورہ زبان کے مطابق ہونا چاہئے۔

۳۔ الفاظ کے وزن اضافی کا خیال رکھنا چاہئے تاکہ اصل عبارت میں ان کی جو اضافی اہمیت ہے وہ ترجمے میں بھی باقی رہے۔

۴۔ حتی الامکان ایسے الفاظ کے ترجمے سے گریز نہیں کرنا چاہئے جن کے مترادفات اردو میں پہلے سے موجود نہ ہوں۔ زبان کو وسعت دینے کا طریقہ یہی ہے کہ یہاں تک ممکن ہو ہر لفظ کا مترادف تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔ خواہ وہ مترادف ناموس ہی کیوں نہ ہو۔

۵۔ اصل عبارت میں جملہ اگر اس قدر پیچیدہ اور لمبا ہو کہ اس کا تحت اللفظ ترجمہ کرنے سے معنی میں الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہو تو ایسی صورت میں جملے کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر لینا چاہئے۔'' (۱۴)

بنیادی طور پر ترجمے کے تین مقاصد ہیں۔

۱۔ معلوماتی: ترجمہ کس مقصد کے لیے کیا جا رہا ہے معلوماتی مقاصد پیش نظر ہیں یا تہذیبی اور جمالیاتی۔

۲۔ تہذیبی: کس کے لیے کیا جا رہا ہے تاکہ مترجم اپنے مخصوص تہذیبی گروہ کو پیش نظر رکھ کر ان کے ردعمل اور دائرہ تفہیم کے مطابق اصل کو ترجمے کی شکل میں پیش کرے۔

۳۔ جمالیاتی: کسی قسم کی تحریر کا ترجمہ منظور ہے ناول، افسانہ اور ڈرامہ مختلف قسم کے ترجمے کے متقاضی ہیں۔ سائنسی ترجموں کا اسلوب کچھ اور ہے اور نظموں کے ترجمے کا کچھ اور۔ ان تمام نزاکتوں اور لطافتوں کو پیش نظر رکھنا مترجم کا کام ہے۔

> ''قوموں کی زندگی میں کبھی ایسا بھی لمحہ آتا ہے جب علوم وفنون کی تنویری قوت مدھم پڑ جاتی ہے ایسی صورت میں یہ ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اپنے مائل بہ انحطاط علوم کو دوسری بڑھتی ہوئی ترقی یافتہ قوموں کے علوم سے توانا بنائیں۔''(۱۵)

ادیب اپنے دور کا عکاس ہوتا ہے وہ اپنے دور کے ماحول اور حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ ایک باہوش، پرخلوص ادیب اپنے ماحول میں جو کچھ دیکھتا ہے یا جو کچھ محسوس کرتا ہے وہ اس کی حقیقی تصویر لفظوں کی صورت میں پیش کر دیتا ہے۔ ادیب باضمیر انسان ہوتا ہے وہ ایک ذمہ دار شخص کی حیثیت میں معاشرے کے بیدار ضمیر کی مثال ہے۔ مگر مترجم کے بارے میں ڈاکٹر نثار قریشی کی رائے یہ ہے کہ،

> ''ہم جس زبان سے ترجمہ کرتے ہیں اس کے الفاظ ہمیں عزیز نہیں ہوتے اور نہ ہمیں اس کی لسانی خوبیوں سے کوئی تعلق ہوتا ہے۔ ہمیں لفظوں کی شکل وصورت ان کے تلفظ اور ان کے حسن اور موسیقی سے کوئی دلچسپی

نہیں ہوتی۔دلچسپی ہوتی ہے تو صرف اس شے سے جو لفظوں کے پرے کسی طلسمی راز کے طور پر موجود ہوتی ہے۔ہم اسے برآمد کرنے اور اپنی زبان میں کامیابی اور ایمان داری سے منتقل کرنے کے لئے الفاظ کے سب ناطے اور اصل زبان کے سلسلے فراموش کر دیتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ اصل زبان مر چکی ہے اور ہم اس کے جادو سے اپنی زبان کو زندہ کرنا چاہتے ہیں۔''(۱۶)

جو چیز لغت سے زیادہ کارآمد ہے وہ ہے اس زبان کے ادب کا عام مطالعہ جس سے ترجمہ کیا جارہا ہے۔جس زبان میں ترجمہ کرنا ہے اس پر ماہرانہ عبور حاصل ہو۔اصل تصنیف کی زبان سے زیادہ قدرت اس زبان میں ہونی چاہئے جس میں ترجمہ کرنا مقصود ہے۔ یہاں تک کہ اس زبان میں خود لکھ لینے کی پختہ مشق ہونی چاہئے اور اس زبان کا پورا پورا علم ہونا چاہئے۔اب اگر ترجمہ کرنے والے کو یہ معلوم نہیں ہے کہ فلاں فلاں ترکیب اس موضوع کی خاص اصطلاحیں ہیں اور ان کا اس شعبے یا اس علم میں الگ الگ مفہوم ہے تو وہ لغت کی مدد سے ترجمہ کر دے گا اور عبارت کے سارے مفہوم کو غارت کر دے گا۔ یہاں تک کہ اگر خود اس سے کہا جائے کہ تم اپنا ترجمہ پڑھ کر اس کا مطلب سمجھاؤ تو وہ نہیں سمجھا سکے گا۔

''ایک شخص ادب سے واقف ہے اور فلسفہ نہیں جانتا یا فلسفے کے موٹے موٹے اصولوں سے بے خبر ہے تو وہ برٹرنڈ رسل کی کتاب کا ترجمہ کرتے وقت برٹرنڈ رسل کی صورت تو مسخ کرے گا ہی لیکن خود اس زبان میں فلسفے کے مضامین سے لوگوں کو نفرت دلائے گا۔''(۱۷)

ایک شخص سیاست کے میدان کا کھلاڑی ہے لیکن ادب کی چاشنی سے بہت کم واسطہ رکھتا ہے تو وہ میخائیل شولوخوف کے ناول ''اورڈان بہتا رہا'' کی ادبی نزاکتوں پر پانی پھیر دے گا یا جہاں ترجمے میں اٹکاؤ آئے گا وہاں سے چھلانگ لگا جائے گا۔

''ترجمے میں مصنف کے الفاظ کو دوسری زبان میں منتقل کرنا دراصل ذریعہ ہے مقصد نہیں ہے۔مقصد تو مفہوم اور خیال کی ادائیگی ہے۔اگر الفاظ کو دوسری زبان میں منتقل کرنے سے وہ مفہوم پوری طرح ادا نہیں ہوتا یا اسی قوت کے ساتھ ادا نہیں ہوتا تو کٹر لوگوں کے ہر ایک الزام کو سہہ کر الفاظ، ان کی تقدیم و تاخیر، ان کے جوڑ اور جملوں کی ساخت کو بدل کر یہ مقصد پورا کرنا ہوگا۔یہی ترجمے کا مقصود ہے اور اسی مقصود کو پورا کرنا دیانت داری ہے۔مثال کے طور پر کارل مارکس کی تصنیف ''Doscapital'' جب جرمن زبان میں تیار ہوئی تو اس کے چند سال بعد فرانسیسی، جرمن اور انگریزی زبانوں کے ماہر اور معاشیات کے فاضل مسٹر J-Ray نے اسے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔جب یہ ترجمہ مکمل ہو چکا تو مارکس نے اس پر نظر ڈالی یہاں مارکس اس مترجم کے بارے میں لکھتا ہے۔اس نے خوب جی لگا کر احتیاط کے ساتھ اپنے فرض کو پورا کیا لیکن اس نے احتیاط اور توجہ میں اتنی شدت برتی کہ جو ترجمہ ہوا وہ حد سے زیادہ لفظ بہ لفظ ہو گیا حد سے زیادہ لفظ بہ لفظ (Tooliteral) ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مارکس نے اس پر نظر ثانی کی اور خود اپنی تصنیف کے ترجمے میں جگہ جگہ کانٹ چھانٹ کر دی۔''(۱۸)

کسی فن پارے یا ادبی تخلیق کو ترجمے کے ذریعے کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں کیونکہ ہر زبان کا اپنا مزاج اپنا آہنگ اور اسلوب و پیرایہ بیان ہوتا ہے۔علاوہ ازیں روزمرہ تشبیہات، محاورات، ضرب الامثال، استعارات و کنایات مخصوص معاشرتی معاشی تاریخی اور سیاسی زندگی کی نمائندگی اور تہذیب و تمدن کی عکاسی کرتے ہیں۔

''صرف وہ ادیب دوسری زبانوں کی کتابوں کو ترجمہ کرتے رہتے ہیں جن کے پاس اپنے طور پر پیش کرنے کے لئے کچھ نہیں ہوتا۔وہ صرف دوسروں کی لکھی ہوئی چیزوں کو اپنی زبان میں نقل کرتے رہتے ہیں اور خود کو ادیبوں کی فہرست میں شامل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔''(۱۹)

لیکن یہ حقیقت کے برعکس ہے آج کی دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں بھی ہر سال ہزاروں کی تعداد میں غیر ملکی زبانوں کے ادب سے شہ پاروں کو ترجمہ کر کے مترجم اور ادیب حضرات اپنی زبان کے علمی سرمائے میں قارئین کے لیے اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

> ''گئے وقتوں میں انگریزی سے یا انگریزی کی معرفت ہمارے ہاں جو کچھ منتقل ہوا وہ اپنی کوئی روایت نہیں بنا سکا اور ہم نے مغرب کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کا محض خواب دیکھا۔ اس تکنیکی طریقہ کار نے'' ہماری گلی'' از احمد علی اور'' قیامت ھمر کاب آئے نہ آئے'' از محمد حسن عسکری جیسے دو اچھے افسانے دیئے۔ لیکن آج یہ طریقہ کار ڈائجسٹوں میں لکھنے والی خواتین تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ آج کی نئی نسل کے سامنے اس تکنیکی طریقہ کار کا معیار تا حال جیمز جوائس ہی ہے۔ احمد علی اور عسکری کے دو اہم افسانے نہیں۔''(۲۰)

ترجمہ چونکہ تخلیق سے علیحدہ چیز ہے اور انسان شعوری طور پر کسی متن کو اپنی زبان میں منتقل کرتا ہے اس لیے ترجمے کا جواز عموماً جو سمجھا جاتا ہے یوں اگر دیکھیں تو یہ جواز خود تراجم کے اندر موجود ہوتا ہے۔ مثلاً آپ نے دیکھا ہوگا کہ پابندیوں کے خلاف زمانے میں ایسے افسانوں اور ایسی نظموں کے تراجم زیادہ ہونے لگتے ہیں جن میں پابندیوں کے خلاف باغیانہ لہجہ یا جبر کا احساس نمایاں ہو۔ ایسی صورت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بہت سے ادیبوں کی یہ روحانی ضرورت بن گئی ہے یا وہ شعوری طور پر تہذیبی اور سماجی صورت حال کے پیش منظر میں ایک خاص نوع کی تخلیقات سے دل چسپی لینے پر مجبور ہیں۔ وہ باتیں جو خود نہیں کر سکتے انہیں ترجموں کی زبان سے ادا کر رہے ہیں۔ اس طرح کے تراجم خود ان ادیبوں کے گرد کھڑے جبریت کے حصار کو کسی حد تک توڑتے ہیں۔ اور قاری بھی صورت حال کے بعض کوائف کو ان میں پہچان کر ایک حد تک ان کے ذریعے جبر و احتساب کی فضا سے نکل آتا ہے۔ اس لحاظ سے ان تراجم کا جواز اصل تخلیقات کے بعض موضوعات میں پوشیدہ ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد حسن، ترجمہ نوعیت اور مقصد، مرتبہ، ترجمہ کا فن اور روایت، قمر رئیس، ڈاکٹر، تاج پبلشنگ ہاؤس، ۴۸۹ میٹا محل جامع مسجد دہلی، سن، ص ۶۹

۲۔ غلام علی الانا، ادب میں تراجم کی اہمیت، مرتبہ، اعجاز راہی، اردو زبان میں ترجمے کے مسائل روداد سیمینار، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص ۱۸

۳۔ نثار قریشی، ڈاکٹر، مرتبہ، ترجمہ، روایت اور فن، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۲۶

۴۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، کتابیات تراجم جلد اول، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱

۵۔ حاجی احمد فخری، اردو تراجم، مشمولہ، مجلّہ اردو، دکن، ۱۹۲۹ء، ص ۵۹۴

۶۔ حامد بیگ مرزا، مغرب سے نثری تراجم، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص ۱۴

۷۔ حامد بیگ مرزا، مغرب سے نثری تراجم، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص ۱۵

۸۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، اردو میں تراجم کے مسائل، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت، قمر رئیس، ڈاکٹر، تاج پبلشنگ ہاؤس دہلی سن ن، ص ۱۶۰

۹۔ ظہیر احمد صدیقی، اردو میں تراجم کے مسائل، مشمولہ، ترجمہ کا فن اور روایت، مرتبہ، قمر رئیس، ڈاکٹر، تاج پبلشنگ ہاؤس دہلی، سن ن، ص ۱۷۸

۱۰۔ ظہیر احمد صدیقی، اردو میں تراجم کے مسائل، مشمولہ، ترجمہ کا فن اور روایت، مرتبہ، قمر رئیس، ڈاکٹر، تاج پبلشنگ ہاؤس دہلی، سن ن، ص ۱۷۹

۱۱۔ انیس ناگی، تصورات، پبلی کیشنز لاہور، سن ن، ص ۵۸

۱۲۔ حاجی احمد فخری، دور تراجم مطبوعہ، رسالہ سہ ماہی، اردو انجمن ترقی اردو (دکن)، اکتوبر ۱۹۲۹ء، ص ۵۹۳

۱۳۔ آل احمد سرور، نظر اور نظریے، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، سن ن، ص ۲۷۱

۱۴۔ ظ۔ انصاری، ترجمے کے بنیادی اصول، مطبوعہ، ادب لطیف لاہور، اگست ۱۹۵۳ء، ص ۱۹

۱۵۔ اصغر عباس ڈاکٹر، سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے تراجم، مشمولہ، ترجمہ کا فن اور روایت، مرتبہ، قمر رئیس ڈاکٹر، تاج پبلشنگ ہاؤس دہلی، سنن، ص ۲۳۹

۱۶۔ نثار قریشی، ڈاکٹر، مقدمہ، ترجمہ، روایت اور فن، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۲۰، ۲۱

۱۷۔ ضمیر اظہر، اردو تراجم کا جائزہ (غیر مطبوعہ)، مقالہ برائے، ایم۔اے اردو، کراچی یونیورسٹی، بابت سال ۵۵۔۱۹۵۴ء، ص ۴۷

۱۸۔ مظفر علی سید، فن ترجمہ کے اصولی مباحث، مشمولہ، روداد سیمینار، اردو زبان میں ترجمہ کے مسائل، مرتبہ، اعجاز راہی، مقتدرہ قومی زبان، طبع اول، ۱۹۸۶ء، ص ۲۷

۱۹۔ مرزا حامد بیگ، مغرب سے علمی و ادبی تراجم، مشمولہ، نقوش، محمد طفیل، شمارہ، ۱۳۷، جلد ۱۸۹، ادارہ، فروغ اردو لاہور، دسمبر ۱۹۸۸ء، ص ۱۸۶

۲۰۔ میر حسن، مغربی تصانیف کے اردو تراجم، ادارہ ادبیات، اردو حیدر آباد دکن، طبع اول، ۱۹۳۹ء، ص ۴۷